بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

جہاد کے بعض احکام

سید جلال الدین عمری

جہاد اسلامی ریاست کا عمل ہے

جہاد اسلامی ریاست کے دائرۂ اختیار میں ہے۔ ضرورت پڑنے پر وہ جہاد کرے گی۔ اسلامی ریاست میں بھی اس کا اختیار افراد کو نہیں ہے کہ جو چاہے جہاد کے نام پر کھڑا ہو جائے اور جسے دشمنِ اسلام سمجھے اس پر یورش کر دے۔ ریاست کی طرف سے جہاد کا اعلان ہو تو جن لوگوں کو اس میں شرکت کے لیے کہا جائے گا ان کے لیے شرکت لازمی ہوگی۔ وہ بغیر عذر کے اس سے پیچھے نہیں رہ سکتے۔ ایسے نازک موقع پر جو لوگ پیچھے رہ جائیں قرآن مجید نے ان پر سخت تنقید کی ہے۔ ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ ۚ أَرَضِيتُم بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ۝ إِلَّا تَنفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

(التوبۃ : ۳۸-۳۹)

اے ایمان والو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے راستے میں دوڑو تو تم زمین سے چمٹ جاتے ہو؟ کیا آخرت کو چھوڑ کر تم دنیا کی زندگی پر خوش اور مطمئن ہو گئے ہو حالانکہ آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی محض تھوڑا سا ساز و سامان ہے۔ اگر تم جہاد کے لیے نہ نکلو گے تو اللہ تمہیں دردناک عذاب دے گا اور تمہاری جگہ دوسری قوم کو بدل دے گا اور تم اس کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکو گے۔ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہے کہ امام جب جہاد کے لیے آواز دے تو جہاد فرض

ہو جائے گا۔ اس آیت کے ذیل میں علامہ قرطبی کہتے ہیں :

إن الإمام إذا عيّن قومًا	جب امام کچھ لوگوں کو متعین طور پر جہاد
وندبهم الى الجهاد لم يكن	کی دعوت دے تو ان کے لیے جائز نہ ہوگا
لهم ان يتّا قلوا عند التعيين	کہ وہ تعیین کے بعد بیٹھے رہیں۔ اس لیے
ويصير بتعيينه فرضًا على	کہ امام متعین طور پر جن لوگوں کو جہاد کا حکم دے
من عيّنه لا لمكان الجهاد	وہ ان کے لیے فرض ہو جائے گا۔ جہاد کی
ولكن لطاعة الامام [1]	وجہ سے نہیں بلکہ امام کی تعیین کی وجہ سے۔

حدیث میں یہ بات وضاحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے کہ جہاد سربراہِ ریاست یا امام کی سربراہی میں ہوگا۔ وہ جن لوگوں کو جہاد میں شرکت کا حکم دے، ان کے لیے اس کی تعمیل ضروری ہوگی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔

لا هجرة بعد الفتح ولكن	فتحِ مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے۔ البتہ
جهاد ونية واذا استنفرتم	جہاد اور (اس کی) نیت باقی ہے اور
فانفروا [2]	جب تم سے جہاد کے لیے نکلنے کا مطالبہ ہو تو نکل پڑو۔

ایک اور حدیث میں کہا گیا ہے کہ جہاد امام کے تحت ہونا ہے۔ ارشاد ہے :

إنّما الإمام جُنّةٌ يُقاتَل	بے شک امام ڈھال ہے، اس کے
من ورائه ويُتّقىٰ به وإن أمر	پیچھے جنگ کی جاتی ہے اور اس کے ذریعہ
بتقوى الله وعدل فإن له	تحفظ حاصل کیا جاتا ہے، اگر وہ اللہ سے
بذلك أجرًا وإن قال	تقویٰ کا حکم دے اور انصاف کرے تو اس
بغيره فان عليه منه [3]	کا اسے اجر ملے گا۔ لیکن اگر وہ دوسرا رویّہ
	اختیار کرے تو اس کا وبال اس پر ہوگا۔

حدیث کے الفاظ "الإمام جُنّة" (امام ڈھال ہے) کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح

---

[1] قرطبی: الجامع لاحکام القرآن ٨/٩١، دار الکتب العلمیہ لبنان ١٩٨٨ء

[2] بخاری: کتاب الجہاد والسیر، باب وجوب النفیر الخ مسلم: کتاب الامارۃ، باب المبایعۃ بعد فتح مکۃ الخ

[3] بخاری: کتاب الجہاد والسیر، باب یقاتل من وراء الامام ویتّقیٰ بہ: مسلم، کتاب الامام، باب الامام جنۃ الخ

ڈھال مخالف کے حملوں کو روکتی ہے، اسی طرح امام دشمن کے وار کو روکتا ہے۔ وہ کسی فرد یا گروہ کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ مسلمانوں کو کسی قسم کا ضرر یا تکلیف پہنچائے۔ اسی طرح خود مسلمانوں کو ایک دوسرے پر ظلم و زیادتی اور ایذا رسانی سے باز رکھتا ہے۔ آگے اسی کی تشریح کی گئی ہے کہ یُقاتَل من ورائه ویُتّقیٰ به۔ (اس کے پیچھے جنگ کی جاتی ہے اور اس کے ذریعہ مشکلات اور پریشانیوں میں تحفظ حاصل کیا جاتا ہے۔[1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ امام ریاست کا نگراں اور محافظ ہے۔ اس کی ذمہ داری ہے کہ ریاست کو دشمن کی یورش سے بچائے، لوگوں کو جان و مال اور ان کے حقوق کا تحفظ فراہم کرے اور کسی بھی جارحیت کے مقابلہ میں ڈھال بنا رہے۔ اس کے لیے وہ جہاد کرے تو ریاست کے شہری اس کے پیچھے کھڑے ہوں گے اور اس کے جھنڈے تلے جہاد کریں گے۔ حدیث کے آخر میں کہا گیا ہے کہ اگر وہ حق و انصاف کا معاملہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے اجر و ثواب سے نوازے گا اور اگر وہ ظلم و زیادتی کی روش اپنائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی باز پرس ہوگی۔ بعض دوسری حدیثوں میں یہ بات اور زیادہ صراحت کے ساتھ کہی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لیے جہاد ہمیشہ جاری رہے گا، لیکن یہ امام یا سربراہِ مملکت کے تحت ہوگا۔ ایک حدیث میں ہے کہ امام خدا ترس اور متقی ہو یا غلط کار اور فاسق، جب تک وہ امیر ہے جہاد میں اس کا ساتھ دیا جائے گا اور اس کی قیادت میں جنگ کی جائے گی۔

الجهاد واجب عليكم	جہاد تم پر واجب ہے ہر امیر کے ساتھ
مع كل أميرٍ برًّا كان أو فاجرًا	چاہے وہ نیک ہو یا غلط کار اور چاہے
وإن عمل الكبائر[2]	وہ کبائر کا ارتکاب کر رہا ہو۔

---

[1] حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ "الإمام جُنّة" کا مطلب یہ ہے کہ امام دشمن کے مقابلے میں سینہ سپر ہوتا ہے اور مسلمانوں کی حفاظت کرتا ہے۔ "یُقاتَل من ورائه" کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ (ورا) کے اصل معنی تو پیچھے کے ہیں لیکن یہ لفظ آگے اور پیچھے دونوں معنی میں بولا جاتا ہے اور یہی دونوں معنی یہاں مراد ہیں۔ امام کے آگے اور پیچھے ہر طرف سے جنگ کی جائے گی اور اس کی حفاظت کی جائے گی۔ فتح الباری ۶/۲۱۸۔

[2] ابو داؤد، کتاب الجهاد، باب الغزو مع أئمة الجور۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ابوداؤد اور ابو یعلیٰ نے

اس سے اتنی بات واضح ہے کہ جہاد اسلامی ریاست کے امام یا امیر کے تحت ہوگا۔ اس کی وجہ واضح ہے۔ جہاد بے مقصد قتل وخوں ریزی نہیں، بلکہ اعلیٰ مقاصد کے لیے کی جانے والی جنگ ہے۔ اس سے متعلق بہت سے نازک مسائل ہیں۔ اس کے لیے باقاعدہ اور تربیت یافتہ فوج کا پایا جانا اور اس کا پوری طرح کنٹرول میں اور حکم کا پابند ہونا ضروری ہے پھر یہ طے کرنا ہوگا کہ کس سے جنگ ہو اور کس سے صلح؛ اگر جنگ ہو تو اس کے کیا تقاضے ہیں اور صلح ہو تو کن شرائط پر ہو؛ جنگ کے بعد کے معاشی، سیاسی، اخلاقی، ملکی اور بین الاقوامی مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی کیا صورت ہوگی؟ جنگ میں فتح ہو تو مفتوح اقوام کے ساتھ کیا معاملہ ہو، شکست ہو تو اس کے کیا نتائج ہوں گے اور ان پر قابو پانے کی کیا تدبیر کی جائے گی؟ یہ سب امور ریاست کے دائرے میں آتے ہیں، وہی ان کی مخاطب ہے، اسلام نے بہت تفصیل سے ان تمام پہلوؤں سے ریاست کی راہنمائی کی ہے۔ فرد اس کا مخاطب نہیں ہے اس لیے کہ وہ اس کا بوجھ اٹھا نہیں سکتا۔ اسی وجہ سے علماء نے لکھا ہے کہ جہاد کا معاملہ ریاست سے متعلق ہے۔ علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں۔

أمر الجهاد موكول الى الإمام	جہاد کا معاملہ امام اور اس کے اجتہاد
واجتهاده ويلزم الرعية طاعته	کے حوالے ہے۔ عوام کے لیے لازم ہے کہ
فی مایراه [1]	امام جو فیصلہ کرے اس میں اس کی اطاعت کرے۔

= مرفوع اور موقوف دونوں طریقوں سے روایت کی ہے۔ اس کے رواۃ قابل قبول ہیں۔ البتہ یہ روایت ابو ہریرہؓ سے مکحول تابعی نے کی ہے اور مکحول کا ابو ہریرہؓ سے سماع ثابت نہیں ہے۔ فتح الباری۔ ۶/۱۴۴

امیر اگر فسق وفجور میں مبتلا ہو تو امت کی کیا ذمہ داری ہے؟ امام الحرمین کہتے ہیں "حاکم وقت اگر ظلم و زیادتی اور من مانی کرنے لگے، فہمائش سے باز نہ آئے تو اہل حل وعقد کو متفق ہو کر اسے برطرف کر دینا چاہیے، چاہے اس کے لیے ہتھیار اٹھانا اور جنگ کرنی پڑے۔ شرح المقاصد ۵/۲۳۳، ۲۳۴۔ عالم الکتب بیروت ۱۹۸۹ء۔ یہ بات غالباً ان ممالک کے لیے پیش نظر کہی گئی ہے جہاں بادشاہت یا آمریت ہو۔ لیکن جمہوری ملکوں میں بغیر تلوار اٹھائے پرامن طریقہ سے بھی تبدیلی آسکتی ہے۔ اس پر تفصیلی بحث کا یہ موقع نہیں ہے۔

[1] ابن قدامہ: المغنی ۱۳/۱۶، ھجر، القاہرہ ۱۹۹۲ء

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں:

انہم لایخرجون الا باذن	لوگ امیر کی اجازت ہی سے جہاد کے لیے
الأمیرا لّا ان یفجأهم العدو[1]	نکلیں گے الّا یہ کہ دشمن ان پر اچانک حملہ کردے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاد کا فیصلہ کرنا امیر مملکت کے ہاتھ میں ہوگا۔ عام لوگ اس کے فیصلہ کے پابند ہوں گے، البتہ اگر کبھی ریاست کے کسی ذمہ پر خصوصاً سرحدی علاقہ پر دشمن کا اچانک حملہ ہوجائے اور ریاست کے سربراہ کو اس کی خبر ہونے یا اس کی طرف سے جہاد کا حکم جاری ہونے میں تاخیر ہو تو مقامی افراد بلا اجازت اسی ملک کا دفاع کریں گے۔ موجودہ دور میں اس طرح کی صورتِ حال کا امکان کم ہے۔ ہر مملکت سرحدی حالات سے باخبر رہتی ہے اور باقاعدہ فوج سرحدوں کی نگرانی کرتی ہے۔ اس لیے جنگ کا فیصلہ بہرحال ریاست ہی کے اختیار میں ہوتا ہے۔

جہاد فرض کفایہ ہے

بعض اوقات جہاد کا اس طرح ذکر ہوتا ہے جیسے یہ ہر مسلمان پر فرض ہے اور جو اس میں کوتاہی کرے گا وہ گناہگار ہوگا۔ کفار اور مخالفین سے جنگ پوری امت کا نصب العین ہے اور اسلام اسی کے لیے اس کے ایک ایک فرد کو تیار کرتا ہے۔ یہ اسلامی تعلیمات کی غلط ترجمانی ہے۔ اسلام نے دین کی حفاظت اور سربلندی کے لیے جہاد کی ترغیب ضرور دی ہے اور اس کا بے پایاں اجر و ثواب بھی بیان کیا ہے۔ لیکن اسے ہر ایک پر فرض نہیں قرار دیا ہے۔ قرآن نے صراحت کی ہے۔

لَا یَسْتَوِی الْقَاعِدُوْنَ مِنَ	اہلِ ایمان میں سے وہ جو معذور نہیں ہیں پھر بھی بیٹھے
الْمُؤْمِنِیْنَ غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ	رہتے ہیں اور وہ جو اللہ کے راستہ میں اپنے مالوں
وَالْمُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ	اور جانوں سے جہاد کرتے ہیں، برابر نہیں
بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ	ہوسکتے۔ وہ لوگ جو اپنے مالوں اور جانوں
اللّٰهُ الْمُجٰهِدِیْنَ بِاَمْوَالِهِمْ	سے جہاد کرنے والے ہیں اللہ نے انہیں بیٹھ
وَاَنْفُسِهِمْ عَلَی الْقٰعِدِیْنَ دَرَجَةً	رہنے والوں پر ایک درجہ فضیلت عطا کی ہے
وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی وَفَضَّلَ	اللہ نے ہر ایک سے بھلائی کا وعدہ کیا ہے

---

[1] ابن قدامہ: المغنی: ۱۳/ ۱۵۲

اللّٰہُ الْمُجٰہِدِیْنَ عَلَی الْقٰعِدِیْنَ اَجْرًا عَظِیْمًا ہ دَرَجٰتٍ مِّنْہُ وَ مَغْفِرَۃً وَّ رَحْمَۃً ط وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ہ (النساء: ۹۵-۹۶)	اور اللہ نے مجاہدین کو بیٹھ رہنے والوں پر اجرِ عظیم کی فضیلت دی ہے۔ جو اس کی طرف سے درجات اور مغفرت اور رحمت ہے اور اللہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

فقہی اصطلاح میں یوں کہا جائے گا کہ جہاد فرضِ عین نہیں بلکہ فرضِ کفایہ ہے، یہ اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے دفاع کا نظم کرے اور جو قوتیں برسرِ پیکار ہیں ان کے مقابلہ کے لیے جتنی افرادی قوت کی ضرورت ہے وہ فراہم کرے۔ جہاد میں وہی لوگ شریک ہوں گے جنھیں اسلامی ریاست اس کے لیے تیار کرے گی اور جو اس کی فوج میں شامل ہوں گے۔ ان آیات میں مجاہدین کی فضیلت کے بیان میں 'درجہ' اور 'درجات' کے الفاظ آئے ہیں۔ اس کی توجیہ علامہ زمخشری نے یہ کی ہے کہ جو لوگ جہاد میں شرکت سے معذور رہیں ان کے مقابلہ میں مجاہدین کو ایک درجہ فضیلت ہے اور جو غیر معذور جنگ میں شریک نہیں ہیں ان پر مجاہدین کو کئی درجہ فضیلت اور برتری حاصل ہے۔ زمخشری کے الفاظ ہیں۔

وأما المفضّلون درجات فالذین فُضّلوا علی القٰعدین الذین أذن لہم التخلّف اکتفاءً بغیرہ لأن الغزو فرض کفایۃ [1]	جن لوگوں کو کئی درجہ فضیلت حاصل ہے، یہ فضیلت ان لوگوں کے مقابلہ میں ہے جن کو جہاد میں عدم شرکت کی اس وجہ سے اجازت دے دی گئی کہ اس کے لیے دوسرے لوگ کافی تھے، اس لیے کہ جہاد فرضِ کفایہ ہے (سب پر فرض نہیں ہے)

آیت کے الفاظ وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی (اللہ نے ہر ایک سے بھلائی کا وعدہ کیا ہے) سے استدلال کرتے ہوئے علامہ ابن کثیر کہتے ہیں:۔

فیہ دلالۃ علی أن الجہاد لیس بفرض عین بل ہو فرض علی الکفایۃ [2]	اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ جہاد فرضِ عین نہیں ہے بلکہ یہ فرض علی الکفایہ ہے۔

---

[1] زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل: ۱/۵۴۲-۵۴۳ - دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۹۹۵ء

[2] ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم: ۱/۵۴۱

فقہ حنبلی میں کہا گیا ہے۔

الجہاد فرض علی الکفایۃ إذا قام بہ قوم سقط عن الباقین	جہاد فرض علی الکفایہ ہے۔ جب کچھ لوگ اسے انجام دیں تو باقی لوگوں سے ساقط ہوجاتا ہے۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی نے جہاد کے فرضِ کفایہ ہونے کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے۔

معنی فرض الکفایۃ الذی ان لم یقم بہ من یکفی أثم الناس کلھم وان قام بہ من یکفی سقط عن سائر الناس فالخطاب فی ابتدائہ یتناول الجمیع ۱	فرضِ کفایہ کے معنی یہ ہیں کہ اگر اتنے افراد اس پر عمل نہ کریں جو اس کے لیے کافی ہوں تو سب ہی لوگ اس کوتاہی کے لیے گنہگار ہوں گے اور اگر اس پر اتنے لوگ عمل کریں جو اس کے لیے کافی ہوں تو یہ سب سے ساقط ہوجائے گا۔ اس لحاظ سے خطاب ابتدا میں تمام ہی لوگوں کو شامل ہوتا ہے۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ میں جہاد کی قانونی حیثیت اور اس کی علت ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

وھو (الجہاد) فرض علی الکفایۃ لأنہ ما فرض لعینہ إذ ھو إفساد فی نفسہ وإنما فُرض لإعزاز دین اللہ ودفع الشر عن العباد فإذا حصل المقصود بالبعض سقط عن الباقین کصلاۃ الجنازۃ ورد السلام ۲	جہاد فرضِ کفایہ ہے، وہ اس لیے فرض نہیں کیا گیا ہے کہ بذاتہٖ مقصود ہے۔ اس لیے کہ وہ فی نفسہٖ خونریزی ہے۔ وہ درحقیقت اللہ کے دین کی سربلندی اور بندوں سے شر کو دفع کرنے کی خاطر فرض کیا گیا ہے جب یہ مقصود بعض افراد کے ذریعہ حاصل ہوجائے تو باقی سے ساقط ہوجائے گا۔ جیسے نماز جنازہ اور سلام کے جواب کا معاملہ ہے۔

---

۱ ابن قدامہ: ۶/۱۳۔ ہجر، القاہرہ، ۱۹۹۲ء

۲ ہدایہ مع فتح القدیر: ۵/۴۲۱-۴۲۲ دارالکتب العلمیہ: لبنان ۱۹۹۵ء

علامہ کاشانی نے بھی جہاد کے فرضِ کفایہ ہونے کی یہی توجیہ کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

لأن مافرض له الجهاد	جس مقصد سے جہاد فرض کیا گیا ہے
وهو الدعوة الى الإسلام	وہ ہے (پہلے) اسلام کی دعوت دینا، دین
وإعلاء الدين الحق ودفع	حق کو سربلند کرنا اور منکرین کے شر، ان کے
شر الكفرة وقهرهم يحصل	قہر اور غلبے کو دفع کرنا۔ یہ مقصد بعض لوگوں
بقيام البعض [1]	کے کھڑے ہوجانے سے حاصل ہوجاتا ہے۔

اس سے جہاد کا مقصد واضح ہے۔ وہ ہے (جہاد سے پہلے) اسلام کی دعوت، دین حق کی سربلندی، مخالفین اور معاندین کے شر اور ان کے غلبہ اور قہر کو دفع کرنا۔ یہ مقصد جب بعض افراد کے ذریعہ پورا ہوسکتا ہے تو اس کے لیے ریاست کے تمام مسلمانوں کا میدانِ جنگ میں کود پڑنا ضروری نہیں ہے۔ اسی پہلو سے جہاد کو فرض کفایہ کہا گیا ہے۔

جہاد کے فرضِ عین نہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی دی گئی ہے کہ اگر ہر فرد اس میں لگ جائے تو زراعت، تجارت اور صنعت وحرفت جیسی دوسری ضروریات پوری نہیں ہوسکتیں اور خود جہاد بھی نہیں کیا جاسکے گا۔[2]

جہاد کب فرضِ عین ہوتا ہے؟

بعض ایسے حالات اور مواقع بھی آتے ہیں جب کہ آدمی کے لیے جہاد اختیاری عمل نہیں رہتا بلکہ فرضِ عین ہوجاتا ہے۔ علماء نے ان کی بھی تعیین کی ہے۔ جہاد کے بارے میں اسلام کا موقف سمجھنے کے لیے ان سے واقفیت ضروری ہے۔ علامہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں۔

"جہاد فرضِ کفایہ ہے لیکن یہ تین صورتوں میں فرضِ عین ہوجاتا ہے۔ ایک یہ کہ محاذِ جنگ

---

[1] کاشانی: بدائع الصنائع: ۷/ ۱۲۵ - ۱۲۶

[2] مرغینانی، ہدایہ۔ علامہ ابن الہمام کہتے ہیں کہ جہاد کو فرضِ عین قرار دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ سب کے سب ایک ساتھ جہاد کے لیے نکل پڑیں۔ باری باری یہ فرض ادا ہوسکتا ہے۔ اسی میں مذکورہ نقصان نہیں ہے۔ اصل دلیل سورۂ نساء کی آیت ۹۵ ہے جو جہاد کے فرضِ کفایہ ہونے کی صراحت کرتی ہے۔ ہدایہ مع فتح القدیر: ۵/ ۲۲۲ - ۲۲۳

پر دونوں طرف کے لشکر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوں۔ اس صورت میں اسلامی فوج کے ہر سپاہی کے لیے جہاد فرض ہو جائے گا اور کسی بھی شخص کے لیے جنگ سے فرار جائز نہ ہوگا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی مسلم آبادی پر دشمن کا غلبہ ہو جائے (یعنی اسلامی ریاست کے کسی شہر پر مخالف طاقت کا قبضہ ہو جائے) اس صورت میں وہاں کے باشندوں میں سے ایک ایک کے لیے اس کا مقابلہ کرنا اور اسے اپنے علاقہ سے نکال باہر کرنا فرض ہو جائے گا۔ تیسری صورت یہ کہ امام کی طرف سے نفیرِ عام (عام لام بندی کا حکم) ہو۔ اس وقت جس علاقہ سے اس کا خطاب ہوگا اس میں جو فرد بھی جنگ کے قابل ہوگا اسے امام کی آواز پر حاضر ہونا ضروری ہوگا۔[1]

یہ وہ صورتیں ہیں جن میں دنیا کی ہر ریاست اپنے شہریوں پر جنگ میں شرکت اور دشمن کے مقابلہ کو لازم قرار دیتی ہے۔ کسی فوجی کا محاذِ جنگ سے فرار اختیار کرنا ہمیشہ سے ایک سنگین جرم رہا ہے۔ ریاست کے کسی حصہ پر دشمن کا قبضہ ہو اور وہاں کے باشندے خاموشی سے اس قبضے کو برداشت کرلیں اور اس کی مدافعت نہ کریں تو اسے ریاست سے عدمِ وفاداری کے ہم معنی سمجھا جائے گا اور اس کے خلاف سخت کارروائی ہوگی۔ اسی طرح ریاست کسی وقت ان افراد اور جوانوں کو جو جنگ کے قابل ہیں، محاذِ جنگ پر بھیجنا چاہے تو اس کی آواز پر لبیک کہنا ضروری ہوگا۔ اس سے بچنے کی ہر کوشش قابلِ مذمت اور قابلِ تعزیر خیال کی جائے گی۔

اس سے واضح ہے کہ جہاد فرضِ کفایہ ہے، البتہ بعض حالات میں یہ فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ ان حالات کا تعلق ریاست کی ضروریات اور اس کی بقا اور سلامتی سے ہے۔

فرضِ عین فرضِ کفایہ پر مقدم ہے

یہ ایک اصولی بات ہے کہ کسی فرضِ عین کو پس پشت ڈال کر فرضِ کفایہ پر عمل نہیں ہوگا۔ اسے جہاد ہی سے متعلق ایک مثال سے واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

---

[1] ابن قدامہ، المغنی: ۸/۱۲

جہاد کے لیے والدین کی اجازت کی شرط

والدین اگر خدمت کے محتاج ہوں تو انھیں نظر انداز کر کے جہاد میں شرکت صحیح نہیں ہے اس لیے کہ جہاد فرضِ کفایہ ہے اور والدین خدمت کے محتاج ہوں تو ان کی خدمت فرضِ عین ہے۔ احادیث میں یہ بات بڑی صراحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد میں شرکت کی اجازت طلب کی۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ کیا تمہارے والدین حیات ہیں؟ اس نے عرض کیا ہاں! آپ نے فرمایا:

ففیھما جاھد [۱] — تو تم ان کے سلسلہ میں جہاد کرو۔

مطلب یہ کہ اپنی قوت اور توانائی ان کی خدمت میں لگاؤ۔ مسلم کی ایک روایت میں اس کی مزید تفصیل ملتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں ہجرت اور جہاد کے لیے آپ سے بیعت کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے میرے پیش نظر اجر و ثواب ہے۔ آپ نے دریافت فرمایا کیا تمہارے والدین میں سے کوئی حیات ہے؟ اس نے کہا دونوں ہی حیات ہیں۔ آپ نے فرمایا: کیا تم اللہ سے اجر و ثواب چاہتے ہو؟ اس نے کہا۔ ہاں۔ آپ نے فرمایا:-

فارجع الی والدیک فاحسن صحبتھما [۲] — اپنے والدین کے پاس واپس جاؤ اور ان کے ساتھ بہتر سلوک کرو۔

علامہ شوکانی فرماتے ہیں:-

وفی الحدیث دلیل علی أن بر الوالدین قد یکون أفضل من الجھاد [۳] — حدیث میں دلیل ہے اس بات کی کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کبھی جہاد سے افضل ہو جاتا ہے۔

---

[۱] بخاری، کتاب الجہاد، باب الجہاد باذن الابوین۔ مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب برالوالدین وانہما احق بہ

[۲] مسلم، حوالہ سابق

[۳] شوکانی: نیل الاوطار: ۷/ ۲۵۰۔ مطبعہ مصطفیٰ البابی الحلبی قاہرہ، مصر ۱۹۷۱ء

روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں آپ کے ساتھ جہاد میں شریک ہونا چاہتا ہوں، لیکن اس طرح آیا ہوں کہ میرے ماں باپ میری جدائی سے رو رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

فارجع الیهما فاضحکهما کما ابکیتهما [1]	ان کے پاس واپس جاؤ۔ انھیں اس طرح ہنساؤ (خوش کرو) جس طرح تم نے انھیں رلایا ہے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص یمن سے سفر کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا اور جہاد میں شرکت کی خواہش ظاہر کی۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ کیا یمن میں تمہارا کوئی رشتہ دار بھی ہے؟ اس نے عرض کیا۔ ہاں! ماں باپ ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کیا انھوں نے تمھیں اس کی اجازت دی ہے؟ اس نے کہا، اجازت نہیں دی ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

ارجع الیهما فاستأذنهما فان اذن لک فجاهد والا فبرهما	واپس ان کے پاس جاؤ، ان سے اجازت طلب کرو۔ اگر وہ اجازت دیں تو جہاد کرو۔ ورنہ ان کے ساتھ حسن سلوک کرو۔

جاہمۃ السلمی کا بیان ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا کہ میرا ارادہ غزوے میں شرکت کا ہے۔ آپ سے مشورے کے لیے حاضر ہوا ہوں، آپ نے دریافت کیا کہ کیا تمہاری ماں حیات ہے؟ انھوں نے اثبات میں جواب دیا آپ نے فرمایا:

فالزمها فان الجنة تحت رجلیها [3]	اسے پکڑے رہو اس لیے کہ جنت اس کے قدموں کے نیچے ہے۔

---

[1] ابوداؤد، کتاب الجهاد، باب الرجل یغزو وابواہ کارہان

[2] نسائی، کتاب الجهاد، باب الرخصة فی التخلف لمن له والدة۔ ابن ماجہ میں یہ روایت زیادہ تفصیل سے آئی ہے۔ کتاب الجهاد، باب الرجل یغزو وله ابوان

[3] ابن رشد: بدایة المجتهد ونهایة المقتصد: ۳/۴۰۹۔ دار الکتب العلمیہ لبنان ۱۹۹۶ء

جہاد پر جانے کے لیے والدین کی اجازت ضروری ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ والدین کی خدمت فرضِ عین بن جائے اور جہاد کی حیثیت فرضِ کفایہ کی ہو تو والدین کی خدمت کو مقدّم رکھا جائے۔ انھیں بے یار ومدد گار چھوڑ کر جہاد کے لیے جانا صحیح نہ ہوگا، لیکن اگر جہاد فرضِ عین ہو جائے اور محاذِ جنگ پر جانا لازم قرار پائے تو والدین کے منع کرنے یا ان کی مجبوری کے باوجود آدمی جہاد پر جائے گا۔

علامہ ابن رشد نے اس مسئلہ میں فقہاء کا نقطۂ نظر ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

عامة الفقهاء متّفقون	عام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ فریضۂ
على أنّ مِنْ شرط هٰذه	جہاد کی ایک شرط یہ ہے کہ اس میں والدین
الفريضة إذن الأبوين فيها	کی اجازت حاصل ہو الّا یہ کہ وہ فرضِ عین
الّا ان تكون عليه فرض عين	ہو جائے مثال کے طور پر کسی جگہ اس فرض
مثل ان لا تكون هنالك من يقوم	کے ادا کرنے کی یہی صورت ہو کہ سب لوگ
بالفرض الا بقيام الجميع به[1]	اس کے لیے کھڑے ہو جائیں۔

علامہ شوکانی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "فَإن أذِنا فجاهدْ" (اگر ماں باپ اجازت دیں تو تم جہاد کرو) یہ دلیل ہے اس بات کی کہ جہاد میں شرکت کے لیے والدین کی اجازت حاصل کرنا واجب ہے۔ یہی جمہور کی رائے ہے۔ انھوں نے قطعیت کے ساتھ کہا ہے کہ ماں باپ یا ان میں سے کوئی ایک جہاد پر جانے سے منع کرے تو اولاد کے لیے جہاد پر جانا حرام ہے۔ اس لیے کہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک فرضِ عین ہے اور جہاد فرضِ کفایہ۔ ہاں اگر جہاد فرضِ عین ہو جائے تو ان کی اجازت ضروری نہ ہوگی۔

مزید فرماتے ہیں: ابن حبان کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد کے لیے والدین کی اجازت ضروری نہیں ہے۔ اسے اس صورتِ حال پر محمول کرنا ہوگا جب کہ جہاد فرضِ عین قرار پائے اس سے دونوں طرح کی روایات میں تطبیق ہو جاتی ہے[2]

---

[1] ابن رشد: بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد: ۳/ ۴۰۹۔ دارالکتب العلمیہ لبنان ۱۹۹۶ء

[2] شوکانی، نیل الاوطار: ۷/ ۲۵۰

غیر مسلم والدین کا حکم

ایک سوال یہ بھی فقہاء کے درمیان زیر بحث رہا ہے کہ کیا غیر مسلم والدین کا بھی وہی حکم ہے جو مسلم والدین کا ہے؟ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کی رائے یہ ہے کہ اس کے لیے ان کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی دلیل انھوں نے یہ دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ جہاد کے لیے نکلتے تھے اور مخالفین کی صف میں ان کے کافر ماں باپ ہوتے تھے۔ ان سے اجازت لے کر وہ شریکِ جہاد نہیں ہوتے تھے۔ لیکن امام ثوریؒ کہتے ہیں کہ ماں باپ کافر ہوں تو بھی ان کی اجازت ہی سے آدمی جہاد پر جائے گا۔[1]

فقہ مالکی میں کہا گیا ہے کہ والدین کو اس بات کا حق ہے کہ فرض کفایہ کی ادائیگی کے لیے سفر پر جانے سے اولاد کو روک دے، چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہوں۔ البتہ جہاد کا معاملہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ جہاد پر جانے سے اولاد کو روکنے کا کافر والدین کو حق نہیں ہے، اس لیے کہ اس میں اس بات کا اندیشہ ہے کہ وہ اسلام کی توہین و تذلیل کے جذبے سے اسے روک رہے ہوں۔ لیکن اگر قرائن سے معلوم ہو جائے کہ شفقت و محبت کی وجہ سے اسے وہ منع کر رہے ہیں تو ان کی بات مانی جائے گی۔[2]

علامہ ابن عابدین حنفی کہتے ہیں "ماں باپ کو اور ان میں سے ہر ایک کو اس بات کا حق ہے کہ وہ اولاد کو جہاد پر جانے سے روک دیں۔ اس سے وہ گنہ گار نہیں ہوں گے اگر ماں باپ کو اولاد کے سفر پر جانے سے شدید تکلیف ہو رہی ہے یا بے توجہی سے ان کے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہے تو وہ منع کر سکتے ہیں۔ اس معاملے میں فقہ حنفی میں کافر اور مسلمان والدین میں کوئی فرق نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ کافر ماں باپ کفر کی محبت میں جہاد سے روک رہے ہوں تو ان کی بات نہیں مانی جائے گی۔[3]

۱؎ ابن قدامہ : المغنی : ۱۳/ ۲۶

۲؎ صاوی علی الشرح الصغیر : ۲/ ۲۷۴

۳؎ ابن عابدین : رد المحتار علی الدر المختار ۶/ ۲۰۲

بعض مزید وضاحتیں

جہاد میں شرکت کے لیے والدین کی اجازت کے ذیل میں فقہاء نے بعض اور باتوں کی وضاحت کی ہے۔ یہاں اختصار کے ساتھ انہیں پیش کیا جارہا ہے۔

۱۔ جہاد میں جان کا خطرہ ہے۔ اس میں ایک طرف تو والدین کی ضروریات اور ان کے حقوق کا بھی خیال رکھا گیا ہے اور دوسری طرف ان کے جذبات کی بھی رعایت ہے۔ اس وجہ سے فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر آدمی کوئی ایسا سفر کرنا چاہے جس میں اس کی جان کو بظاہر کوئی خطرہ نہ لاحق ہو تو اس کے لیے والدین کی اجازت ضروری نہیں ہے۔ یہ والدین کی نافرمانی نہیں سمجھی جائے گی۔ علامہ کاشانیؒ کہتے ہیں:

والأصل ان کل سفر لا یؤمن فیه الهلاك ویشتدّ فیه الخطر لا یحلّ للولد ان یخرج إلیه بغیر إذن والدیه لأنهما مشفقان علی ولدهما فیتضرّران بذلك، وکل سفر لا یشتدّ فیه الخطر یحلّ له ان یخرج الیه بغیر إذنهما، لأنهما لا یتضرّران بذلك بل ینتفعان به فلا یلحقه سمة العقوق [۱]	اس میں اصل یہ ہے کہ ہر وہ سفر جس میں آدمی ہلاکت سے محفوظ نہ ہو اور شدید خطرہ ہو تو اولاد کے لیے جائز نہیں ہے کہ اپنے والدین کی اجازت کے بغیر اس طرح کے سفر پر جائے کیونکہ وہ ان پر مہربان ہوتے ہیں اور اس طرح کے سفر سے ان کو نقصان پہنچے گا، اس کے برخلاف کوئی بھی ایسا سفر جس میں شدید خطرہ نہ ہو تو اولاد کے لیے جائز ہے کہ والدین کی اذن کے بغیر سفر کرے۔ اس لیے کہ اس سے ان کو کوئی ضرر نہیں لاحق ہوگا بلکہ وہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ لہٰذا اولاد پر والدین کی نافرمانی کا الزام نہیں آئے گا۔

---

[۱] کاشانی: بدائع الصنائع ۱۲۶/۷

اسی بنیاد پر کہا گیا ہے کہ والدین کی اجازت کے بغیر اولاد تجارت، حج اور عمرہ یا تعلیم کی خاطر سفر کر سکتی ہے۔[۱]

۲۔ جہاد کے معاملہ میں والدین اور اولاد کا جو حکم ہے وہی حکم بیوی اور شوہر کا بھی ہے شوہر کی اجازت کے بغیر عورت جہاد پر نہیں جا سکتی۔ اس لیے کہ شوہر کے حقوق اس کے لیے فرض عین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہاں اگر جہاد اس پر فرض ہو جائے تو وہ اس کی اجازت کے بغیر بھی اس میں شریک ہو گی۔ اس سلسلے میں فقہاء نے آقا اور غلام کی مثال بھی دی ہے۔ غلام اپنے مالک کی اجازت ہی سے جہاد کے لیے جا سکتا ہے۔ (غلامی کا مسئلہ اس وقت عملاً نہیں ہے لیکن اس سے مسئلہ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے) اسی طرح قرض دار کے بارے میں بہت سے فقہاء کی رائے ہے کہ وہ اسی وقت جہاد پر جا سکتا ہے جب کہ قرض دینے والا اس کی اجازت دے۔ اس لیے کہ اس میں اس کے حق کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔ ہاں اگر وہ ادائیگی قرض کا انتظام کر دے یا کوئی اس کا کفیل ہو تو وہ اس کی اجازت کے بغیر بھی جہاد پر جا سکتا ہے۔[۲]

۳۔ والدین کے احترام اور ان سے اجازت کی خاص اہمیت ہے لیکن شرعی فرائض کی ادائیگی میں انسان ان کی اجازت کا پابند نہیں ہے۔ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں:

"جہاد فرض قرار پائے تو والدین کی عدم اجازت کا اعتبار نہیں ہے۔ اس لیے کہ فرض کا ترک کرنا معصیت ہے۔ یہی حکم حج، باجماعت نماز، جمعہ میں شرکت اور ضروری علم کے لیے سفر کا ہے۔ یہ والدین کی اجازت پر منحصر نہیں ہے۔ امام اوزاعی کہتے ہیں کہ فرائض کی ادائیگی، جمعہ، حج اور جہاد (جب وہ فرض ہو جائے) سے والدین منع کریں تو ان کی اطاعت نہ ہو گی کیوں کہ یہ سب فرائض ہیں۔ ان کا حکم نماز کا حکم ہے۔"[۳]

اسلام نے جن اعلیٰ مقاصد کے لیے جہاد کا حکم دیا ہے، اسلامی ریاست کو ان

---

[۱] ابن عابدین: ردالمحتار علی الدرالمختار ۶/ ۲۰۲، ۲۰۳

[۲] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ ابن عابدین: ردالمحتار علی الدرالمختار: ۶/ ۲۰۳ - ۲۰۵۔ ابن قدامہ: المغنی ۱۳/ ۲۷، ۲۸۔ حاشیۃ الصاوی علی الشرح الصغیر: ۲/ ۲۷۴

[۳] ابن قدامۃ: المغنی ۱۳/ ۲۶ - ۲۷

مقاصد کی تکمیل کے لیے جہاد کا حق ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اسلام نے افراد کے حقوق اور ملکی اور تمدّنی ضروریات کو بھی خاص اہمیت دی ہے۔ اسے نظرانداز کرنا صحیح نہ ہوگا۔ اسلام نے مقاصدِ جہاد اور انسانی حقوق کے درمیان بے مثال توازن قائم کیا ہے۔ فرد اور ریاست دونوں اس کے پابند ہیں کہ اس توازن کو برقرار رکھیں اور اسے نقصان نہ پہونچنے دیں۔

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی کی ایک پیشکش

عہدِ نبوی کا نظامِ حکومت

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی

سیرت نبوی اور اس کے مختلف پہلوؤں پر اب تک چھوٹی بڑی بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا۔ لیکن اس کتاب میں اس لحاظ سے جدت اور ندرت پائی جاتی ہے کہ وہ ایسے موضوعات پر مشتمل ہے جن سے کتب سیرت میں بہت کم تعرض کیا گیا ہے۔ ابتدا میں عہد رسالت میں ریاست کے تدریجی ارتقاء پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے پھر اس کے دورِ مبارک میں شہری نظم ونسق اور فوجی، مالی اور مذہبی نظاموں سے مفصل بحث کی گئی ہے۔

اسلامی تاریخ اور سیرت نبوی پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی کا خاص موضوع ہے۔ ان کا نام اعلیٰ تحقیقی معیار کی ضمانت ہے۔

کتاب پر مولانا سید جلال الدین عمری صدر ادارہ اور نائب امیر جماعت اسلامی ہند کا مختصر اور مفید مقدمہ بھی ہے۔

آفسٹ کی خوبصورت طباعت، عمدہ کاغذ، صفحات ۱۳۶ قیمت ۳۰/- زیادہ منگوانے پر خصوصی رعایت

مکتبہ تحقیق وتصنیف اسلامی۔ پان والی کوٹھی۔ دودھ پور علی گڑھ